اسلام اور جمہوریت

Islam and Democracy by John L. Esposito and John O. Voll, Oxford University Press 1996, 232 pages.

جوشوا مراوشک*

ترجمہ: عرفان محمود

جان اسپوزیٹو اور جان وال جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے Center for Muslim Christian Understanding میں بالترتیب ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ مسیحی اسکالرز ہونے کے ناطے انہوں نے غیر مسلموں کو اسلام اور مسلم دنیا کے بارے میں ہمدردانہ اور مثبت آگاہی فراہم کرنا اپنا مشن بنایا ہے۔

زیر نظر کتاب میں انہوں نے اسلام اور جمہوریت کے باہمی تعلق کا جائزہ لیتے ہوئے بالخصوص جمہوریت کے عالمی پھیلاؤ اور اس اسلامی رجحان کا تقابلی مطالعہ کیا ہے جسے اسلامی بنیاد پرستی، اسلام پسندی یا سیاسی اسلام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اس حد تک تو نہیں گئے کہ یہ کہیں کہ اسلام پسندی ہمیشہ جمہوریت کے حوالے سے بہت کشادہ دل رہی ہے لیکن انہوں نے اس مغربی تاثر کی نفی کرنے کی کوشش ضرور کی ہے کہ سیاسی اسلام اور جمہوریت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مصنفین کے مطابق: ''حکومتوں کی پہچان اگر اس طرح کی جائے کہ وہ مذہبی قوانین یا مغربیت میں سے کسی ایک کا نفاذ کرتی ہیں، تو ان کے آمرانہ یا جمہوری ہونے کے بارے میں پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی''۔ نکتہ یہ ہے کہ ''موجودہ صورت حال کا ایک تاریخی پس منظر ہے جسے واحدانی (monolithic) اصطلاحوں میں سمجھنے کی بجائے ایک مرکب اور ہمہ جہت حقیقت کے طور پر سمجھا جانا چاہیے جس میں کہ اسلام اور جمہوریت کے باہمی

---

*جوشوا مراد شک امریکن انٹر پرائز انسٹی ٹیوٹ کے ریذیڈنٹ اسکالر ہیں اور حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب *The Imperative of American Leadership: A challenge to Neo-Isolationism* کے مصنف ہیں۔

تضادات اور تکمیلی اوصاف (complementarities) سامنے آسکیں''۔

اگر چہ اس طرح اسلام اور جمہوریت کا تعلق قدرے دھندلا گیا ہے تاہم مصنفین کے پاس مثبت پہلو سے بات کرنے کو بہت کچھ ہے۔ ان کے خیال میں: ''جمہوریت اور اسلام کا احیاء بہت سے ممالک میں ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنے ہیں''۔ جہاں اسلامی تحریکات متشدد یا قوت واقتدار کی بھوکی نظر آتی ہیں، وہاں اصل اسباب کچھ اور ہیں: اسلامی حزب اختلاف اکثر و بیشتر جمہوری اصلاحات میں اور موجودہ سیاسی نظاموں کے ساتھ تعاون کے سیاق وسباق میں رہتے ہوئے بات کرتی ہیں۔ تاہم یہ اپنے لب ولہجے میں اس وقت انقلابی بن سکتی ہے جب اسے حکومت کی طرف سے ایسا قرار دے دیا جاتا ہے''۔

مصنفین کی رائے میں اگر ہم اہل مغرب، اسلامی تحریکوں کی جمہوری روح کا ادراک کرنے میں ناکام ہیں تو اس کی وجہ ہمارے نسل پرستانہ تصورات ہیں۔ ''امریکہ اور مغربی یورپ میں جمہوریت کے مداح اور وکیل خود کو جمہوریت کی واحد 'جائز' روایت کا اصل وارث خیال کرتے ہیں۔ جبکہ حقیقت میں جمہوریت کی تعریف متعین کرنے کے ایسے بہت سے ممکن زاویے ہو سکتے ہیں جو اسلامی دنیا میں پائے جانے والے تصورات سے قریب تر ہوں''۔ تاہم جب ان ممکن زاویوں کی وضاحت کی بات آتی ہے تو اسپوزیٹو اور وال مخصوص مثالیں دینے میں ناکام رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''جمہوریت کے مغربی ماڈل میں انتخابات اور اصولِ اکثریت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے''۔ یہاں مصنفین جمہوریت کی تین متبادل صورتوں کی نشان دہی کرتے ہیں: 'متفقہ جمہوریت' (Consensual Democracy)، راس پیروٹ (Ross Perot) کی 'قومی برقیاتی ریفرنڈم' (national electronic refrendam) کی تجویز، اور قدیم یونان میں ایتھنز میں مخصوص گروہ میں سے حکومتی عہدیداروں کا انتخاب'۔

مصنفین کے اس طرزِ فکر کو سنجیدہ قرار دینا مشکل ہے۔ انہوں نے نہ تو ''متفقہ جمہوریت'' کی تعریف متعین کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے اور نہ ہی یہ وضاحت کی ہے کہ جب اتفاق رائے موجود ہی نہیں ہے تو فیصلے کس طرح کیے جائیں گے۔ پیروٹ کی تجویز بھی محض بے پر کی اڑانے والی بات تھی۔ جبکہ ایتھنز کی جمہوریت کا جوہر ''مخصوص شہریوں'' (gathered citizenry) کی اجتماعی رائے کا اظہار تھا، جو کہ آج کے حالات میں قابلِ تقلید نہیں۔ مزید یہ کہ مخصوص گروہ میں سے عہدے داروں کے چناؤ

(selection) کے ذریعے بننے والی حکومت 'عوامی' ہونے کی بجائے اتفاق کی پیداوار ہے۔

بلاشبہ اس ساری بحث میں مصنفین موجودہ اسلامی دنیا میں جمہوریت کی کمیابی کا بے ساختہ جائزہ لینے سے قاصر رہے ہیں۔ فریڈم ہاؤس کے قابل اعتماد سالانہ جائزے کے مطابق ۱۹۹۶ء میں کل ۱۹۱ خودمختار ممالک تھے، جن میں سے ۷۶ 'آزاد' تھے، ۶۲ 'جزوی طور پر آزاد' اور ۵۳ ممالک آزادی کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ سروے کے مطابق ۴۳ ممالک میں جہاں مسلمان غالب اکثریت میں ہیں، صرف ایک ملک (مالی) آزاد تھا جبکہ ۱۳ جزوی طور پر آزاد اور ۲۹ ممالک غیر آزاد تھے۔ دوسرے الفاظ میں، دنیا کے غیر مسلم ممالک کی نصف سے زیادہ تعداد آزاد تھی جبکہ محض ۲ فی صد مسلم ممالک کو 'آزاد' کہا جاسکتا تھا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ اکثر مسلم ممالک غربت کا شکار ہیں اور جمہوریت کا اقتصادی ترقی سے گہرا تعلق ہے۔ تاہم اسلامی دنیا میں جمہوریت کی کمزوری کا باعث صرف غربت ہی نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے ہم اسلامی دنیا کا تقابل افریقی ممالک سے کر سکتے ہیں۔ ہر چند کہ افریقہ اسلامی دنیا کی نسبت کہیں زیادہ غریب ہے لیکن اس کے باوجود یہ ان سے زیادہ جمہوری ہے۔ افریقہ میں جمہوریت اگرچہ مغرب کے مقابلے میں کمزور ہے لیکن افریقہ میں، مسلم ممالک کے فقط ایک آزاد ملک کے جواب میں، ۹ آزاد ممالک سامنے آئے ہیں۔ جبکہ افریقہ کے ۳۴ فیصد ممالک میں جمہوریت کے کچھ رسمی عناصر موجود ہیں اور یہ شرح اسلامی دنیا میں موجود شرح سے دوگنا ہے۔ مزید برآں دنیا کے ۱۸ ممالک ایسے ہیں جو فریڈم ہاؤس کے معیارِ آزادی کے تحت خراب ترین پوزیشن پر رہے۔ ان میں سے ۱۱ ممالک کا تعلق اسلامی دنیا سے ہے۔ واضح طور پر یہاں اس صورت حال کے کچھ اسباب یقیناً موجود ہیں۔

اسپوزیٹو اور وال ان اعداد و شمار سے کم ہی آگاہ نظر آتے ہیں اور وہ ان پر اپنے بعض دوسرے مشاہدات کا غبار ڈال دیتے ہیں کہ: ''آمریت کا خطرہ، مذہبی عقائد کی نسبت اقتدار و سیاست، تاریخ اور سیاسی کلچر سے زیادہ جنم لیتا ہے''۔ مگر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر سیاسی کلچر کا مآخذ اور بنیاد یں کیا ہیں؟ اسلامی دنیا میں کئی طرح کی حکومتیں پائی جاتی ہیں لیکن اکثر میں ایک قدرِ مشترک ان کا جبر و استبداد کی طرف رجحان ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مصنفین کے بہتر دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ

مسیحی دنیا، جو آج زیادہ تر جمہوری ہے، آغاز ہی سے ایسی نہ تھی۔ جمہوریت کی افزائش میں بعض مسیحی عقائد نے اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح مسلم دنیا میں بھی یہ ارتقاء پذیر ہو سکتی ہے۔ مصنفین نے بڑی دِقّت نظری کے ساتھ یہ وضاحت کی ہے کہ: ''اسلام کے اندر جمہوری عمل کے لیے ممکنہ مثبت اہمیت کے حامل بعض وسیع تصورات موجود ہیں، مثلاً ''اتفاق رائے'' اور ''شورائیت'' (consultation) اور کئی ایسے تصورات اور روایات ہیں جو ایک آئینی حزب اختلاف کے لیے بنیاد فراہم کر سکتے ہیں اور مطلق العنان حکومت کے لیے کچھ حدود کا تعین کرتے ہیں''۔

مگر ان تصوراتی امکانات کے واقعی صورت بننے میں ابھی کافی وقت لگے گا۔ اسلام اور جمہوریت کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے ابھی خاصی پیش رفت کی ضرورت ہے۔ تاہم اسپوزیٹو اور وال جیسے مصنفین سے اس پیش رفت میں کوئی مدد نہیں ملے گی جو اسلامی دنیا میں موجود بعض رجعت پسندانہ رجحانات کے حوالے سے انتہائی معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اسے محض ایک مغربی 'انداز' (style) قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں۔

اسپوزیٹو اور وال تسلیم کرتے ہیں کہ (ایران اور سوڈان میں) برسر اقتدار آنے والی اسلامی تحریکیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور غیر جمہوری سرگرمیوں کی مرتکب ہوئی ہیں۔ تاہم وہ توازن کے طور پر دوسری اسلامی تحریکوں کا ذکر کرتے ہیں جو جمہوری اقدار کا دعویٰ کرتی ہیں اور اپنے اپنے ممالک میں مطلق العنان بادشاہوں یا سیکولر آمروں کو اقتدار سے باہر کرنے کے لیے کوششیں کر رہی ہیں۔ لیکن وہ یہ واضح حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جمہوریت کے لیے خلوصِ نیت کی جانچ اس وقت ہوتی ہے جب کوئی تحریک اقتدار حاصل کر لیتی ہے۔ جمہوریت کا دعویٰ اس وقت آسان (اور مفید) ہوتا ہے جب آپ حزب اختلاف میں ہوں۔

اقتدار میں یا اقتدار سے باہر، بہت سے اسلام پسند جمہوریت کے لیے اپنی حقارت و تنفر کو چنداں پوشیدہ نہیں رکھتے۔ مصنفین نے بے جا طور پر یہ لکھا ہے کہ: ''وہ لوگ جو اعلانیہ جمہوریت کی مخالفت کرتے ہیں --- عام طور پر ایک مختصر انتہا پسند فرقے یا گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ـــ جیسے کہ ڈیوڈ کے پیروکار (Branch Davidians) --- یا جیسے اسرائیل میں یہودیوں کے چند انتہائی قدامت پسند گروہ''۔

وہ اس ضمن میں کسی مسلم گروہ کی نشان دہی نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں اسلام پسند جمہوریت کی مخالفت نہیں کرتے سوائے چند لوگوں کے جو''جمہوریت'' کی خارجی اصطلاح کو پسند نہیں کرتے،''— کیونکہ اسلام میں پہلے سے ایسی اصطلاحات موجود ہیں جو حکومت کے معاملات میں عوام کی شرکت اور آزادی کے تصورات کا زیادہ درست طور پر احاطہ کرتی ہیں''۔اسی تناظر میں مصنفین آیت اللہ خمینی کی اس ہدایت کو دیکھتے ہیں کہ ایران کو'ڈیموکریٹک اسلامک ریپبلک' نہیں کہا جائے گا۔لیکن خمینی کے الفاظ اور اعمال میں کوئی فرق نہیں ہے اور''اسلامک ریپبلک آف ایران''میں ان کا لفظ ہی قانون تھا۔

مصنفین نے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ حزب اختلاف میں بھی الجزائر کے اسلام پسندوں کی جمہوریت سے وابستگی نہ ہونے کے برابر ہے۔اس کے دو نمایاں ترین رہنماؤں میں سے ایک، علی بالحاج (Ali Belhadj) نے''جمہوریت کے تصور کو مکمل طور پر مسترد کرتے ہوئے اسے غیر اسلامی قرار دیا ہے''۔جبکہ دوسرے رہنما، عباسی مدنی، نے جمہوریت کو ان مبہم الفاظ کے ساتھ قبول کیا ہے:''ہاں، [اقتدار کا] راستہ انتخابات ہیں---اس کے علاوہ فی الوقت اور کوئی راستہ دستیاب نہیں ہے۔دوسرے تمام راستے اللہ نے بند کر دیے ہیں۔لہٰذا اقتدار میں آنے کا ذریعہ انتخابات ہیں جن کا فیصلہ مقبول عوامی رائے کے ذریعے ہوتا ہے''۔کون کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ دونوں اور ان کے رفقاء اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ آزادانہ انتخابات کا انعقاد کرائیں گے اور ایسی استبدادی اور متشددانہ پالیسیوں سے احتراز کریں گے جو ایرانی اور سوڈانی نظاموں کی شناخت بن چکی ہیں؟

یقیناً بعض ایسے مسلمان بھی ہیں جو جمہوریت پسند ہیں بلکہ جمہوریت کے ایسے حامی بھی پائے جاتے ہیں جو خود کو اسلام پسند گردانتے ہیں۔عراقی جلاوطن، لیث کوبع (Laith Kubba)، جو لندن میں مکالمے کا ایک بین الاقوامی اسلامی فورم چلاتے ہیں، وہ خود کو اس''بڑھتی ہوئی تعداد میں شمار کرتے ہیں جو اسلام کی جدت پسندانہ تعبیر کے حامی ہیں اور ایک ایسا ڈھیلا ڈھالا گروہ تشکیل دیتے ہیں جس کے اثرات مختصر وقت میں ظاہر ہونے کے امکان کم ہیں''۔لیث کوبع کے خیال میں:''بہتر مستقبل کا امکان اس بات میں ہے کہ کثرتیت (pluralism) کو تسلیم کیا جائے، لبرل سیاسی نظاموں کو اختیار کیا جائے اور ساری اسلامی دنیا میں جمہوریت کو فروغ دیا جائے''۔اس کے یہ الفاظ، اسپوزیٹو اور روال کے اس بے ثر و پا تاثر کی